پاکستان میں بنیادی زرعی اصلاحات

اور

پانی کی تقسیم کا مسئلہ

قانونی اور آئینی نقطہ نظر اور جدوجہد

اختر حسین ایڈووکیٹ

عوامی ورکرز پارٹی

زرعی اصلاحات

کسی بھی ملک میں بنیادی سماجی تبدیلیوں اور کسی بھی طرح کی اصلاحات کے لیے عوام اور خاص طور پر سیاسی کارکنوں کا باشعور ہونا ضروری ہے اور یہ ایک ایسی سیاسی پارٹی کے بغیر ناممکن ہے جس کی جڑیں عوام میں پھیلی ہوں اور اس کے کارکن نہ صرف عوام کو بنیادی سماجی تبدیلیوں کے لیے ذہنی طور پر تیار کریں بلکہ ایسی اصلاحات کے عملی نفاذ کے ساتھ کھڑے ہوں تا کہ اس کا فائدہ عوام کی وسیع تر آبادی کو مل سکے اور پورا سماج ترقی کی ایک سطح سے دوسری طرف بڑھ سکے۔ ماضی کے ستر پچھتر سال کے تجربات ہمارے سامنے ہیں کیونکہ ہمارے ملک میں جس طرح کی بھی زرعی اصلاحات 1950-60 اور 1970 کی دہائیوں میں نافذ ہوئیں جن کی تفصیل آگے بیان کریں گے، ان پر عمل درآمد حکمرانوں کی کمٹمنٹ نہ ہونے کے علاوہ عوامی سطح پر سیاسی پارٹی اور اس کے کارکنوں کی تنظیم نہ ہونا بھی ہے جو ان اصلاحات پر عوامی طاقت کے ذریعے عمل کرا سکتے۔ بھارت میں جو بھی زرعی اصلاحات ہوئیں ان پر عمل درآمد حقیقت میں بائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں کے کارکنوں نے عوامی جدوجہد اور طاقت کے ذریعے کرایا۔ اگر عوام میں ان اصلاحات کو قبول کرنے اور سیاسی پارٹی کی تنظیم نہیں ہوگی تو مخالف رجعتی قوتیں با آسانی اس کا فائدہ اٹھا کر رخ پلٹ سکتی ہیں۔ ہمارے سامنے اس کی بڑی مثال افغانستان کا 1978 کا ثور انقلاب ہے جس انقلاب کے پہلے پہلے حکم ناموں میں سود کا خاتمہ تھا جو سودی نظام افغانی معاشرے میں اتنا گہرا تھا کہ لاکھوں کسان سود کے نیچے خوانین کے غلام تھے اس حکم نامے نے کسانوں کو آزادی دلائی تھی۔ خواتین کی خرید و فروخت ختم کی تھی۔ تعلیم عورتوں اور مردوں کے لیے

لازمی قرار دی تھی، زرعی اصلاحات نافذ کی گئی تھیں، مساجد میں معلم و موذن کی تنخواہیں مقرر کی تھیں مگر انقلاب مخالف قوتوں نے افغان معاشرے کی قبائلی ساخت اور پسماندگی کا فائدہ اٹھایا اور انقلاب کے مخالف کھڑا کر دیا، اس میں سامراجی ریشہ دوانیوں اور عملی امداد کے علاوہ سیاسی پارٹی کے اندرونی اختلافات اور عوامی سطح پر غیر منظّم ہونا بھی ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قبائلی و جاگیرداری معاشرے کی تجارتی و صنعتی معاشرے اور سرمایہ دارانہ معاشرے کی سوشلسٹ معاشرے میں تبدیلی کے لیے پیداواری قوتوں کے کردار کے علاوہ شعوری طور پر تبدیلی کے لیے ایسی سیاسی پارٹی ضروری ہے جس کے کارکن سماجی سائنس کے علم سے لیس ہوں اور وسیع تر عوام کو شعوری طور پر اس کے لیے تیار کریں۔

1947 میں پاکستان کے قیام کے وقت یہاں بڑے بڑے زمیندار، جاگیردار اور قبائلی سردار تھے جو ہزاروں، لاکھوں ایکڑ زمین کے مالک تھے اور اس کی وجہ سے اپنا سیاسی و سماجی اثر رکھتے تھے۔ انگریز نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں لینڈڈ ارسٹوکریسی قائم کی تھی اور اسی لینڈڈ ارسٹوکریسی landed aristocracy کے ذریعے حکومت کرتے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے پروگرام میں اس لینڈڈ ارسٹوکریسی کے خاتمے اور بنیادی زرعی اصلاحات کا اعلان کیا تھا لہٰذا اس مسلم لینڈڈ ارسٹوکریسی کا بڑا حصہ مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔ آزادی کے بعد سے اب تک یہی بڑا زمیندار طبقہ نہ صرف مسلم لیگ، پیپلز پارٹی بلکہ ہمارے پورے سیاسی ڈھانچے پر چھایا ہوا ہے۔

پاکستان کے قیام سے ایک سال قبل 1946 میں مسلم لیگ کی قیادت کا ایک اعلیٰ سطحی اجلاس کراچی میں عبداللہ ہارون کے گھر منعقد ہوا جس میں لیاقت علی خان اور خلیق الزماں شامل تھے۔ اس اجلاس میں 1946 میں ہونے والے عام انتخابات خصوصاً سندھ کے حوالے سے غور کیا گیا۔ مسلم لیگی قیادت سندھ میں جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے

جبر اور ہاریوں کی انتہائی مخدوش حالت اور ان میں بے چینی سے واقف تھی، اس لیے ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے زرعی اصلاحات کے مسئلے کو اٹھایا گیا اور قائداعظم کی ہدایات پر سر راجر تھامس کی سربراہی میں سندھ ہاری کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ایک رکن جناب ایم مسعود تھے جو آٹھ سال تک بمبئی پریذیڈنسی میں اسسٹنٹ کلیکٹر اور پھر سندھ/نوابشاہ میں کلیکٹر رہے (ایم مسعود بعد میں مسعود کھدر پوش کے نام سے مشہور ہوئے) اس کمیٹی نے زرعی اصلاحات کے حوالے سے رپورٹ مرتب کر کے فروری 1948 میں حکومت سندھ کو پیش کی مگر جناب ایم مسعود اس رپورٹ سے متفق نہیں تھے کیونکہ اکثریتی ممبران کی رپورٹ سے سندھ کی زرعی معیشت میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے 79 صفحات پر مشتمل اپنا طویل اختلافی نوٹ لکھا جس میں انہوں نے مقامی طور پر جاگیر داری اور بڑی زمینداریوں اور ان کے معاشی و سیاسی اثرات کا ذکر کیا اور ثابت کیا کہ قومی اور بین الاقوامی طور پر معاشی ترقی کے لیے جاگیرداری نظام اور اس کی باقیات کا مکمل خاتمہ ضروری ہے۔ جس میں انہوں نے روس، جاپان، یوگوسلاویہ اور دیگر ممالک کی مثالیں دیں ان کے مطابق مذہب اسلام میں بھی زمین کی انفرادی ملکیت کا تصور نہیں ہے۔ زرعی زمین اس کی ہے جو کاشت کرتا ہے، ان کے اختلافی نوٹ میں چند سفارشات درج ذیل ہیں:

1۔ انقلابی اصلاحات کے ذریعے زمیندارانہ ملکیت کا خاتمہ کر دیا جائے اسی سے ہاریوں/کسانوں کی وسیع آبادی کو جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے چنگل سے آزادی مل سکتی ہے۔

2۔ غیر حاضر زمینداری کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا جائے اور زمین ہاریوں/کسانوں اور کاشت کاروں میں تقسیم کر دی جائے۔ تقسیم کے لیے حد اور ضروری قوانین تشکیل دیئے جائیں۔

3۔ بیراجز کی زمین بھی بے زمین کسانوں میں تقسیم کردی جائے

4۔ زمین کی کسی بھی قسم کی لیز پر مکمل پابندی ہو، کیونکہ ملکیت اسلام کے خلاف ہے۔

5۔ کوئی بھی کسان اس وقت تک زمین اپنے قبضے میں رکھ سکتا ہے جب تک وہ خود کاشت کرتا ہے، وہ ہمیشہ کے لیے مالک نہیں ہوسکتا۔

6۔ زمین کی مالک ریاست ہوگی اور وہ کاشت کاروں کو کاشت کی سہولت اور ذرائع پیداوار مہیا کرے گی۔

7۔ جن زمینداروں سے زمین لی جائے ان کو معاوضے کا تعین ریاست کرسکتی ہے۔

8۔ ریاست ان اصلاحات پر عمل درآمد کے لیے قانون سازی کرے اور عملی اقدام اٹھائے۔

حکومت سندھ نے دسمبر 1948 میں ہاری کمیٹی کی اکثریتی رپورٹ تو عام کی مگر جناب ایم مسعود کے اختلافی نوٹ اور تجاویز شائع کرنے سے نہ صرف انکار کردیا بلکہ ایک حکم نامے کے ذریعے پابندی لگادی، جس کے نتیجے میں ہاریوں اور ترقی پسند سیاسی کارکنوں میں بے چینی پھیل گئی اور اس کو شائع کرنے کے لیے احتجاج شروع ہوگیا۔ حکومت سندھ کے فیصلے کی زمینداروں اور انگریزی (سوائے ڈان) اور سندھی پریس نے مکمل حمایت کی بلکہ زمینداروں نے علماء سے فتوے جاری کرائے کہ جناب ایم مسعود کا اختلافی نوٹ اور زرعی اصلاحات کی تجاویز اسلام کے خلاف ہیں جن میں مولانا عبدالحمید بدایونی کا فتویٰ قابل ذکر ہے انہوں نے کہا کہ ایم مسعود کمیونسٹ ہے اور ان کی رپورٹ اسلام کے خلاف ہے جس پر پابندی لازم ہے لیکن اس رپورٹ کے حوالے سے سندھ میں احتجاج جاری رہا بالآخر 20 جون 1949 کو یوسف ہارون کی وزارتِ اعلیٰ نے (جو خود زمیندار طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے) جناب ایم مسعود کے اختلافی نوٹ کو شائع کرنے کی اجازت دے دی مگر سندھ میں جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے سیاسی اثرات کی وجہ سے زرعی

اصلاحات کا کوئی قانون نافذ نہ ہوسکا۔

آزادی کے بعد سب سے پہلے مشرقی پاکستان میں جناب نورالامین کی وزارت اعلیٰ کے دور میں صوبائی حکومت نے East Pakistan acquisition land tenancy act, 1951 پاس کیا جس کے تحت انگریز کی قائم کردہ لینڈڈ ارسٹو کریسی کا مکمل خاتمہ کردیا گیا اور زرعی زمین کی 30 ایکڑ حد ملکیت قائم کرکے بنیادی زرعی اصلاحات نافذ کیں اور غیر حاضر زمینداری ختم کردی۔ بھارت میں بھی اسی طرح سے 1953ء میں بنیادی زرعی اصلاحات کے ذریعے بڑی زمینداریاں ختم کردی گئیں۔ مشرقی پاکستان کی زرعی اصلاحات کا اثر یہ رہا کہ مغربی پاکستان کے جاگیردار طبقے اور نوکر شاہی نے گٹھ جوڑ سے ایسی سیاسی منصوبہ بندی شروع کی کہ مشرقی پاکستان کی عددی اکثریت پاکستان کی سیاست ومعیشت پر بالادستی قائم نہ کرسکے۔ ون یونٹ کا قیام اور پیریٹی سسٹم اسی منصوبہ بندی کا حصہ تھا اور طویل سیاسی جدوجہد کے بعد جب 1969ء میں ون یونٹ ٹوٹا اور ایک فرد ایک ووٹ کے اصول کو پہلی دفعہ تسلیم کرتے ہوئے 1970 میں عام انتخابات ہوئے تو اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ کی قومی اسمبلی میں اکثریت کے باوجود اس کو اقتدار دینے سے انکار کرکے مشرقی پاکستان کو الگ کردیا گیا اور بنگلہ دیش بن گیا اور اس طرح مغربی پاکستان اور موجودہ نئے پاکستان میں بڑے زمیندار طبقے نے اپنی سماجی وسیاسی بالادستی قائم رکھی۔

مغربی پاکستان میں 1951 میں پنجاب اسمبلی کے انتخابات ہوئے اور میاں ممتاز دولتانہ کی حکومت قائم ہوئی۔ 1952 میں گورنر پنجاب نے زرعی شعبے سے متعلق آرڈی ننس پاس کیا جس کے تحت کسی مزارع کو زمین کی مزارعت سے بے دخل کرنے پر مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ پابندی لگائی:

1۔ بٹائی نہ دے۔

2۔ زمین کو دیئے گئے مقررہ مقصد کے علاوہ کاشت نہ کرے

3۔ کسی قسم کی سیاسی اور زراعت سے متعلق تحریکوں میں حصہ نہ لے۔

گو کہ زمینداروں کے لیے مشکل نہ تھا کہ ان شرائط کا بہانہ بنا کر بے دخلی کریں مگر پھر بھی اس حکمنامے کا خاصہ اثر ہوا۔ اس کے بعد میاں ممتاز دولتانہ کی حکومت نے 1953ء میں مزید زرعی اصلاحات کا قانون پاس کیا۔ جس کے تحت زمین کی حدِ ملکیت قائم کیے بغیر کہا گیا کہ:

1۔ موروثی مزارعین آدھی قیمت ادا کر کے اپنے زیر کاشت زمین کے مالک بن سکتے ہیں۔

2۔ آئندہ کے لیے موروثیت کا حق ختم کر دیا گیا۔

3۔ بٹائی میں مزارع کا 5/2 حصہ ہوگا۔ مالیہ مالک دے گا اور کھاد بیج مزارع۔

4۔ سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کی پابندی ختم کر دی گئی۔

اس کے بعد ملک میں کئی حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں، 1956 کا آئین بھی تشکیل پایا مگر زرعی اصلاحات کے متعلق مغربی پاکستان میں کوئی قدم مزید نہ اٹھایا گیا۔

1958 میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا اور اس مارشل لائی حکومت نے پہلی دفعہ زرعی اصلاحات کا قانون west Pakistan land reforms regulation 1959 نافذ کیا۔ ان زرعی اصلاحات کے تحت 500 ایکڑ نہری اور 1000 ایکڑ بارانی زمین یا 36,000 PIU (پروڈیوس انڈیکس یونٹ) فی کس رکھنے کی حد ملکیت قائم کی اس کے علاوہ زمیندار شکارگاہیں اور چراگاہیں لامحدود تعداد میں رکھ سکتے تھے۔

زائد زمین مزارعوں اور ہاریوں میں تقسیم کرنے کا اعلان ہوا حاصل ہونے والی زمین

کا معاوضہ سرکار نے 8 روپے فی ایکڑ مالکان کو دیا اور مزارعوں اور ہاریوں سے قسطوں میں وصول کیا گیا۔ ریکارڈ کے مطابق ان اصلاحات کے ذریعے 21 لاکھ ایکڑ زمین حاصل ہونا تھی جو تقریباً 19 لاکھ ایکڑ حاصل ہوئی مگر اس میں قابل کاشت رقبہ صرف 5 لاکھ ایکڑ تھا، باقی بنجر، پتھریلی اور ناقابل کاشت زمین تھی مگر زمینداروں نے اس کا معاوضہ سرکار سے وصول کر لیا۔ ان زرعی اصلاحات سے بڑی زمینداری تو ختم نہیں ہوئی مگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ زمین کی حدِ ملکیت قائم کرنے اور زرعی اصلاحات کی شروعات ہوئی۔

1971 میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نئے پاکستان کے پہلے سویلین مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے تو انہوں نے 1972 میں دوسرا زرعی اصلاحات کا قانون Land Reforms Regulation 1972 جاری کیا جس کے تحت 1959ء کا قانون منسوخ کرتے ہوئے زرعی زمین کی نئی حد ملکیت قائم کی اس قانون کے تحت 150 ایکڑ نہری اور 300 ایکڑ بارانی یا 15,000 PIU (پروڈیوس انڈکس یونٹ) فی کس زمین رکھنے کی حد مقرر کی۔ اس کے علاوہ ٹریکٹر اور ٹیوب ویل کے لیے بیس ایکڑ نہری یا 2,000 PIU رکھنے کی بھی اجازت تھی۔ مزید عزیز و اقارب کو عطیے میں زمین دے سکتے ہیں۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق ان اصلاحات کے تحت 28 لاکھ ایکڑ زمین حاصل ہونا تھی جو صرف 8 لاکھ ایکڑ حاصل ہوئی وہ بھی زیادہ تر ناقابل کاشت۔ ان اصلاحات میں بھی اتنے سوراخ مہیا کیے گئے کہ حقیقت میں حد ملکیت اور خاندانی قبضہ پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا مگر ان اصلاحات کی اہم بات یہ ہے کہ حاصل کی گئی زمین مزارعوں/ ہاریوں میں مفت تقسیم ہوئی۔ مزارعوں کو حق شفع دیا گیا اور گھر بنانے کے لیے 5 مرلہ اسکیم نافذ کی گئی جس نے مزارعوں/ ہاریوں کو کسی حد تک اپنے ہونے کا اعتماد دیا اور زرعی معاشرے میں جمود ٹوٹا اور ہلچل شروع ہوگئی۔

1973 میں ملک کا آئین پاس ہوا آئین کسی ملک کی وہ بنیادی قانونی دستاویز ہے جو ملک کی جغرافیائی، معاشی، سیاسی، سماجی وتنظیمی ساخت کا مظہر ہوتا ہے اس کے تحت ریاست اوراس کا پورا نظام تشکیل پاتا ہے، زندگی کے مختلف شعبوں اور ضروریات کی قانون سازی ہوتی ہے۔ دنیا کے مختلف تحریری آئینی دستاویزات کا تاریخی طور پر تجزیہ کریں تو اس وقت کے اراکین پارلیمنٹ اور سیاسی پارٹیاں جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں ان کے نظریات اور معاشی و سیاسی پروگرام کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی طرح 1973 کے آئین میں سب سے بڑا کردار پاکستان پیپلز پارٹی کا تھا جس کی پارلیمنٹ میں دوتہائی سے زیادہ اکثریت تھی اس کا نظریہ تین نعروں پر تھا:

1۔ جمہوریت ہماری سیاست ہے۔

2۔ سوشلزم ہماری معیشت ہے۔

3۔ مذہب ہمارا اسلام ہے۔

اصل آئین انہی تین نعروں کا ملغوبہ ہے یا ان کے گرد گھومتا ہے۔

یعنی آرٹیکل۔1۔ پاکستان فیڈرل یا پارلیمنٹری ری پبلک

آرٹیکل 2۔ ریاست کا مذہب اسلام

آرٹیکل 3۔ استحصال کا خاتمہ/سوشلسٹک۔ یعنی لکھا ہے کہ

''ریاست اس بنیادی اصول کے تحت کہ ہر شخص سے اس کی قابلیت یعنی علم وہنر کے مطابق کام لیا جائے اور اس کے کام کے مطابق معاوضہ دیا جائے یہ یقینی بنائے گی کہ استحصال کی تمام شکلوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔''

عملی طور پر اسلام کے حوالے سے آرٹیکل 227 تا 231 ہیں یعنی اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل جس میں تمام فرقوں کے علماء اور ماہرین قانون شامل ہوں گے اور اگر کوئی قانون

یا شق قرآن وسنت سے متصادم ہے تو وہ غور کرکے سفارشات حکومت اور پارلیمنٹ کو ارسال کریں گے البتہ قانون بنانا یا ترمیم کرنا پارلیمنٹ کا کام ہے یعنی پارلیمان کا اقتدار اعلیٰ قائم ہے۔

یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جس طرح استحصال سے پاک معاشرے کے قیام کے لیے آئین وقوانین کی دنیاویت پسندی یا سیکولرازم پر بنیادیں ضروری ہیں اس طرح وفاقی مملکت میں مختلف وفاقی اکائیوں یا قوموں کی خودمختاری یا کم ازکم اپنے معاشی وسائل پر قدرت رکھنا بھی ضروری ہے۔ جن اصولوں کی اس آئین میں نفی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وفاق اور صوبوں کے درمیان کش مکش جاری ہے اور آج تک نہ جمہوریت مستحکم ہوئی ہے نہ استحصال کے خاتمے کی طرف پیش رفت۔ اور ریاست کی مذہب پر بنیاد نے نہ صرف مذہبی تنگ نظری، فرقہ پرستی اور انتہا پسندی کو جنم دیا ہے بلکہ ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔

وفاق اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی کشمکش نے نیشنل عوامی پارٹی (NAP) اور پاکستان پیپلز پارٹی (PPP) کے درمیان تصادم کی شکل اختیار کی، نتیجتاً ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خلاف بڑی تحریک نے جنم لیا تو انہوں نے 1977ء میں دوسری زرعی اصلاحات جاری کرنے کا قانون Land Reforms Regulation1977 پاس کیا جس کے تحت زیادہ سے زیادہ 100 ایکڑ نہری اور 200 ایکڑ بارانی یا PIU 8,000 (پروڈیوس انڈکس یونٹ) فی کس کی حد ملکیت قائم کردی مگر ان اصلاحات پر تو کسی طرح کا عمل درآمد نہ ہوسکا کیونکہ جولائی 1977ء میں ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا ملک میں ایک دفعہ پھر جنرل ضیاالحق کی سربراہی میں مارشل لا نافذ ہوگیا۔

جنرل ضیاالحق جنھوں نے اقتدار سنبھالتے وقت حلفیہ طور پر اعلان کیا تھا کہ ان کا مقصد صرف 90 روز میں انتخاب کرانا ہے مگر ملک میں دس سال تک اقتدار پر قابض رہے اور طیارے کا حادثہ نہ ہوتا تو مزید قابض رہتے۔ انہوں نے پہلے تو 1979ء میں

Land Reforms Amendment ordinance 1979 جاری کیا جس کے تحت (1) اگر کوئی زمین 1977ء کی زرعی اصلاحات کے قانون کے تحت لی گئی ہے اور صوبائی حکومت کسی کو لیز کرنا چاہتی ہے تو جس شخص سے یہ زمین لی گئی ہے اس کا پہلا حق ہے کہ خرید لے۔ اس سے استثناء صرف کوآپریٹو سوسائٹیوں اور تعلیمی اداروں کو ہوگا اس طرح سے دیگر آئینی ترامیم سے پہلے ہی انہوں نے زرعی اصلاحات اور بڑی زمینداریوں کے خاتمے کا راستہ بند کر دیا۔

1980ء سے جنرل ضیاالحق نے آئینی ترامیم کرنا شروع کیں، انہوں نے سامراجی پالیسیوں کے عین مطابق اور سماج کو جوں کا توں رکھنے کے لیے مذہب کو ہی سب سے بڑا ہتھیار بنایا بلکہ رجعت پرستی اور پسماندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں لے گیا۔ آئینی ترمیم کے ذریعے آئین میں ایک نیا باب A-3 اور آرٹیکلز A-203 تا J-203 فیڈرل شریعت کورٹ کی صورت میں داخل کیے۔ اگر آپ غور سے مطالعہ کریں تو فیڈرل شریعت کورٹ کے اختیارات آئین کی بنیادوں اور بین الاقوامی طور پر طے شدہ پارلیمانی جمہوریت کے مسلمہ اصولوں کے ہی خلاف ہیں۔ آرٹیکل D-203 شرعی عدالت کو اختیار دیتا ہے کہ کوئی شہری یا حکومت درخواست کے ذریعہ کسی قانون کو چیلنج کر سکتے ہیں یا عدالت از خود ہی کسی قانون یا شق کا جائزہ لے سکتی ہے کہ آیا وہ قرآن وسنت سے متصادم تو نہیں اور اگر ایسا ہے تو فیصلہ کرے گی کہ اس کو مقررہ مدت میں ختم کیا جائے یا ترمیم کی جائے اور اگر صدر مملکت یا صوبائی گورنر عدالت کی ہدایت کے مطابق اقدامات نہیں اٹھاتے اور پارلیمان ترمیم نہیں کرتی تو مقررہ مدت پوری ہونے کے بعد عدالتی حکم از خود ملک کا قانون بن جائے گا۔ یہ اختیار نہ صرف آئین کی بنیادی روح اور پہلے سے طے شدہ آئینی شقوں اور اصولوں کے خلاف ہے بلکہ پارلیمان کے مقتدرہ اعلیٰ ہونے کا ہی خاتمہ کر دیتا ہے۔ یعنی قانون بنانے یا

تبدیل کرنے کا اختیار پارلیمان کے بجائے دو مولویوں اور ایک جج کو دے دیا گیا ہے۔ ہماری سیاسی پارٹیوں جو ضیاالحق کے بڑے خلاف ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اٹھارویں ترمیم کو جمہوریت کا بہت بڑا حاصل سمجھتے ہیں انہوں نے اسی آئینی شق کو نہیں چھیڑا حالانکہ یہ آئین میں پہلے سے دی گئی اسلامی شقوں کے بھی خلاف ہے۔

اس وفاقی شرعی عدالت نے 1980 سے آج تک سود کے بارے میں تو فیصلہ نہیں کیا کہ اس کی تعریف ہی کیا ہے حالانکہ یہ معاملہ اس وقت سے ایک پٹیشن کے ذریعے عدالت کے زیر غور ہے مگر اس عدالت کی سپریم کورٹ کی اپیل بینچ نے قزلباش وقف کی درخواست پر کہ ملک میں زرعی اصلاحات خلاف قرآن وسنت ہیں، کثرت رائے سے فیصلہ دیا کہ 1972 اور 1977 میں نافذ کی گئی زرعی اصلاحات کے قوانین قرآن وسنت سے متصادم ہیں اور ان قوانین کو کالعدم قرار دے دیا (اپیل بینچ کا فیصلہ PLD-1990-SC-99 میں رپورٹ ہے) جس کے نتیجے میں ان اصلاحات کے تحت بڑے بڑے زمینداروں سے لی گئی زمینات (جو زیادہ تر پہلے ہی کاغذات میں تھیں) ان کو واپس ہو گئیں اور ہم زرعی اصلاحات کے حوالے سے ابھی بھی 1947 میں کھڑے ہیں کیونکہ 1959 کی زرعی اصلاحات کے قانون کو 1977 کے قانون نے ختم کر دیا تھا۔ حالانکہ اقلیتی رائے والے جج مرحوم ڈاکٹر نسیم حسن شاہ نے قرآن پاک کی آیت کے حوالے سے فیصلہ لکھا کہ ''زمین وآسمان کا مالک اللہ ہے اور اس کے بعد وہ جو زمین پر ہل چلاتا ہے'' یعنی خود کاشت کرتا ہے اور اپیل بینچ سے پہلے شریعت عدالت نے بھی فیصلہ دیا تھا کہ نہ تو انہیں یہ مقدمہ سننے کا اختیار ہے اور نہ ہی یہ اصلاحات قرآن وسنت سے متصادم ہیں (شریعت عدالت کا فیصلہ PLD-1981-FSC-23 میں رپورٹ ہے)

آپ ذرا غور کریں کہ شریعت عدالت کے علماء اور جج اور اپیل بنچ کی اقلیتی رائے رکھنے

والے جج بھی قرآن وسنت کی روشنی میں ہی فیصلہ دیتے ہیں کہ زرعی اصلاحات اسلام کے خلاف نہیں ہیں عمومی طور پر مذہبی علماء میں اس بات پر اتفاق ہے کہ زرعی اصلاحات ضروری ہیں اور خلافِ اسلام نہیں مگر اپیل بنچ کی اکثریتی رائے سے قانون نافذ ہوجاتا ہے اسی لیے بین الاقوامی طور پر قانون کے فلسفے میں یہ طے شدہ اصول ہے کہ قانون بنانا پارلیمان کا کام ہے اور عدالتیں صرف تشریح کرتی ہیں مگر جنرل ضیاالحق کی جاری کی گئی یہ آئینی ترامیم ایک عجوبے سے کم نہیں جو سماج کو ترقی کی طرف لے جانے کے بجائے پیچھے اندھیروں کی طرف لے جاتی ہے۔اور خلقِ خدا کو معاشی وسیاسی طور پر مزید پسماندہ کردیتی ہے۔

ہم ملک میں جہاں جاگیری وقبائلی باقیات اور بڑی بڑی زمینداریوں کے خاتمے اور زرعی اصلاحات کے لیے جدوجہد کررہے ہیں اور سپریم کورٹ کی شریعت اپیل بنچ کے فیصلے کے خلاف آئین اور محنت کش عوام کے مفادات کے خلاف ہونے پر رائے عامہ ہموار کررہے ہیں وہیں میں نے ورکرز پارٹی کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے سپریم کورٹ میں آئین کے آرٹیکل (3)184 کے تحت پٹیشن (CP No 97/2011) داخل کی ہے جس میں جناب عابد حسن منٹو اور بلال منٹو ہمارے وکیل ہیں جس میں شریعت کورٹ کے مذکورہ فیصلے کو چیلنج کیا گیا ہے۔ہم نے یہ پٹیشن اسلامی بنیادوں پر داخل نہیں کی بلکہ یہ کہا ہے کہ زرعی اصلاحات کو آئین کے آرٹیکلز 24 اور 253 کے تحت تحفظ حاصل ہے اور شریعت عدالت کو قزلباش وقف کی درخواست سننے کا اختیار ہی حاصل نہیں تھا، لہٰذا اس فیصلے کو کالعدم قرار دیا جائے۔اس پٹیشن میں بہت ساری دیگر پارٹیاں بھی ہماری رائے سے اتفاق کرتی ہیں اور ان کی طرف سے بھی بیان داخل ہوئے ہیں بلکہ بعض اس پٹیشن میں ہمارے ساتھ شامل ہیں۔جاگیردارانہ مفادات کی پارٹیاں اور گروپ اپنے مفادات کے لیے خلاف ہیں مگر گیارہ سال کا عرصہ گزر گیا ہے اور ہم نے ہر چیف جسٹس سے جاکر ذاتی

درخواست بھی کی ہے کہ یہ مقدمہ باقی مقدمات سے زیادہ عوامی مفادات کا حامل ہے جس میں کروڑوں کسانوں، ہاریوں، کھیت مزدوروں کا مفاد شامل ہے اور پورے سماج کی ترقی کا مسئلہ ہے مگر ہمارے مقدمے کو نہیں سنا جارہا ہے سپریم کورٹ کو پانامہ لیکس، کرپشن یا دوسرے اسکینڈلز کو سننے سے فرصت نہیں ہے میرے خیال میں ہمیں اس کے لیے بھی عوامی جدوجہد کرنی پڑے گی کہ سپریم کورٹ یہ عوامی اہمیت کا مقدمہ سنے۔

فیڈرل شریعت کورٹ کی اپیل بنچ کے فیصلے کے باوجود ہمارے نقطہ نظر میں زرعی اصلاحات نافذ کرنے کے خلاف کوئی قانونی پابندی نہیں ہے اور پارلیمنٹ کو اختیار ہے کہ عوامی مفاد اور معاشی ترقی کے لیے بھی ایسی قانون سازی کرے مگر چونکہ ہماری پارلیمنٹ میں اکثریت بڑے زمینداروں اور ملکیتی طبقے کی ہے اور بڑی سیاسی پارٹیوں پر ان ہی کی بالادستی ہے لہٰذا زرعی اصلاحات جیسے اہم مسئلے پر پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ان کی طرف سے کوئی آواز نہیں اٹھتی۔2002-2003 کے سروے کے مطابق پورے ملک میں زرعی ودیگر زمینی ملکیت کے حوالے سے چارٹ دیئے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ابھی بھی ہمارے ملک میں ہزاروں ایکڑ زرعی زمین کے مالکان موجود ہیں جو اپنی زرعی ملکیت اور سماجی حیثیت کی وجہ سے تھانہ، تحصیل، کچہری، سیاست وسماج پر گہرا اثر رکھتے ہیں۔

یہ زوال پذیر جاگیرداری وقبائلی باقیات سامراجی عہد کی بدترین یادگار ہیں۔ یہ جاگیری باقیات اور بڑی زمینداریاں اکثر علاقوں میں اپنی آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں اور اپنے انتخابی حلقوں میں سماجی، معاشی وسیاسی اثر ورسوخ کی وجہ سے بہت طاقت ور ہیں اور پوری ریاستی مشینری پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ان کا ثقافتی پنجہ بہت مضبوط ہے، اس کے علاوہ پیر، گدی نشین ان ہی دیہی علاقوں میں اپنا اثر ورسوخ سے جمہوری وسیاسی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

درج ذیل پاکستان کے کل رقبے کی تفصیل

According to the Statistics of Pakistan 2002-03 Publicity by Action Aid

Table No- 1

Land use and Cultivated Area

Land Use	Area(Million Hactare)
Total geographical area	79.61
Total Reported area	59.47
Forest	4.04
Not Available for Cultivation	24.32
Cultivable Waste	9
Cultivated Area	22.11

Table No-2

Farm Size	Farm No.(%)	Farm Area(%) (in million hectare)
Under 0.5 ha	19(%)	2(%)
0.5 under 1 ha	17(%)	4 (%)
1 to under 2 ha	22(%)	10(%)
2 to under 3	15 (%)	11(%)
3 to under 5	13(%)	17(%)
5 t under 10	9(%)	19(%)
10 to under 20	4(%)	16(%)
20 to under 40	1 (%)	10(%)
40 to under 60	-(%)	3(%)
60 and above	-(%)	8(%)

PUNJAB

Number and Area of Farms by size of farms in Acres

Size of farm	Number of farms Total	persent(%)	Farms area(in acres) Total	persent(%)	Culitvate area(in acres) Total	persent(%)
1	2	3	4	5	6	7
Under 1.0	383391	10(%)	175271	1(%)	160592	1(%)
1.0 to under2.5	937512	24(%)	145677	5(%)	1408581	6(%)
2.5tounder2.5	844219	22(%)	2883044	10(%)	2778289	11(%)
5.0to under7.5	597863	15(%)	3469037	12(%)	3315357	13(%)
7.5 to under 12.5	536855	14(%)	5149479	19(%)	4836591	19(%)
12.5to under25.0	368156	10(%)	5986605	22(%)	5489884	22(%)
25.0to under50.0	148787	4(%)	4588070	17(%)	4062726	16(%)
50.0to under 100	36713	1(%)	2251016	8(%)	1954161	8(%)
100.0tounder150	5664	x	646637	2(%)	520610	2(%)
100.0to above	4908	x	1156055	4(%)	912909	1(%)

SINDH

Number and Area of Farms by size of farms in Acres

Size of farm	Number of farms Total	persent(%)	Farms area(in acres) Total	persent(%)	Culitvate area(in acres) Total	persent(%)
1	2	3	4	5	6	7
Under 1.0	11130	1%	5800	x	5571	x
1.0 to under2.5	200833	19%	343866	3%	325704	4%
2.5tounder2.5	278869	26%	997559	9%	928050	12%
5.0to under7.5	197780	18(%)	1135705	11(%)	1019756	13(%)
7.5 to under 12.5	193527	18(%)	1824811	17(%)	1503192	19(%)
12.5to under25.0	102358	10(%)	1758066	16%	1270468	16%
25.0to under50.0	58145	5%	1889427	18%	1340095	17%
50.0to under 100	19615	2%	1257634	12%	785599	10%
100.0tounder150	3938	x	434657	4%	267039	3%
100.0to above	3682	x	1039036	10%	594888	7%

BLOCHISTAN

Number and Area of Farms by size of farms in Acres

Size of farm	Number of farms Total	persent(%)	Farms area(in acres) Total	persent(%)	Culitvate area(in acres) Total	persent(%)
1	2	3	4	5	6	7
Under 1.0	6837	2%	2138	x	1186	x
1.0 to under2.5	44990	14%	74719	1%	58569	2%
2.5tounder2.5	41932	13%	149573	2%	93580	3%
5.0to under7.5	43173	13%	245376	4%	152673	5%
7.5 to under 12.5	70130	21%	685607	11%	466187	15%
12.5to under25.0	65819	20%	1145590	18%	749501	24%
25.0to under50.0	34111	10%	1113183	17%	583762	19%
50.0to under 100	14821	4%	923712	14%	374448	12%
100.0tounder150	3866	1%	421092	7%	153460	5%
100.0to above	4197	1%	1626469	25%	514803	6%

KPK

Number and Area of Farms by size of farms in Acres

Size of farm	Number of farms Total	persent(%)	Farms area(in acres) Total	persent(%)	Culitvate area(in acres) Total	persent(%)
1	2	3	4	5	6	7
Under 1.0	334413	25%	155716	3%	139271	3%
1.0 to under2.5	470321	35%	710786	13%	634503	16%
2.5tounder2.5	260559	19%	866602	16%	741897	18%
5.0to under7.5	127504	9%	726218	13%	591398	14%
7.5 to under 12.5	90939	7%	855756	15%	643086	16%
12.5to under25.0	43405	3%	723658	13%	491899	12%
25.0to under50.0	19481	1%	619154	11%	391901	10%
50.0to under 100	6737	x	414634	7%	215082	5%
100.0tounder150	1640	x	185008	3%	95600	2%
100.0to above	1237	x	331547	6%	148980	4%

ہمیں موجودہ دور کی ان تبدیلیوں کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جاگیرداری باقیات اور بڑی زمینداریوں کے معاشی، سماجی اور سیاسی اثرات اور اقتدار میں بالادستی کے باوجود ٹیکنالوجی اور مشینری کے استعمال نے ہمارے زرعی معاشرے میں بڑی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ پرانے مزارع/ ہاری تعلقات اور بٹائی کے رشتوں کے مقابلے میں بڑے پیمانے پر دیہاڑی دار زرعی کھیت مزدور پیدا ہوگئے کہ نئے بیج، کھاد ار ادویات کے استعمال، کثیر القوامی کمپنیوں کی لوٹ مار نے زمیندار خاص کر چھوٹے زمینداروں کے استحصال اور مشکلات میں مزید اضافہ کردیا ہے۔ یہ کھیت مزدور ایک طرف تو فصلوں کے حساب سے کام کرتا ہے اور بکھرا ہوا اور غیر منظّم ہے اور بے پناہ استحصال کا شکار ہے، یہی بیروزگاروں کی فوج شہروں کا رخ کررہی ہے۔شہروں کی توسیع، تعمیرات اور بلڈرز مافیا نے شہروں کے نزدیک زرعی زمینوں پر قبضہ اور زراعت سے متعلق عوام کی بے دخلی اور قبضہ گیری وسیع پیمانے پر جاری کررکھی ہے۔

جاگیرداری باقیات کا خاتمہ اورزرعی اصلاحات کیوں ضروری ہیں

ہم سمجھتے ہیں کہ سلطنت مغلیہ کے ادوار اور پھر انگریز سامراج نے اپنے اقتدار کو قائم اور جاری رکھنے کے لیے جاگیردار، زمیندار، سر، نواب، خان بہادر قائم کیے۔ان کو جاگیریں اور زمینیں الاٹ کیں اور وہ ان زمینی ملکیتی بالادستی کی بنیاد پر کھیتی باڑی و محنت کرنے والے کسانوں کے استحصال سے راج کرتے تھے اور ان کا اپنا کردار سرکار کی خدمت گزاری اور غریبوں پر راج کا ذہن و کلچر پنپتا تھا جو معاشی و سیاسی ترقی کے ادوار کے ساتھ آج بھی بڑی زمینداریوں اور ان جاگیری باقیات کی شکل میں قائم ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں نے اپنی صنعتی و معاشی ترقی اور ترقی یافتہ جمہوری اداروں کے قیام کے لیے لمبا سفر طے کیا ہے اور کئی طریقے اختیار کیے، ہمارے پڑوسی ملک بھارت نے آزادی کے ساتھ ہی اپنے نئے

جمہوری اداروں کے قیام اور معاشی ترقی کے لیےفوری طور پر زرعی اصلاحات کیں، بڑی بڑی زمینیں زمینداروں سے لے کر کسانوں میں تقسیم کیں اور زمینداروں کو اس کے عوض بانڈ ز دیئے اورتجارت وصنعت میں سرمایہ کاری کی سرمایہ دارانہ پالیسی اپنائی جس سے ایک طرف زرعی معیشت اور دوسری طرف صنعتی ترقی ہوئی اور جمہوری ادارے خان بہادروں، نوابوں اور جاگیرداروں کے ہاتھ سے سرمایہ داروں اور کچھ درمیانے طبقے کی طرف منتقل ہوئے۔ چین میں چونکہ کسانوں اور مزدور طبقے کا1948 میں انقلاب برپا ہوا تو انہوں نے تمام زرعی زمین سرکار کے ہاتھ سے لے لی اور کسانوں و کاشتکاروں کو ان کی کاشت کی بنیاد پر تقسیم کی۔ بنیادی زرعی اور صنعتی ترقی سوشلسٹ بنیادوں پر کی لہذا کسی بھی ملک میں زرعی پیداوار میں اضافے اور معاشی ترقی کے لیےضروری ہے کہ زرعی زمین بڑے اور غیر حاضر زمینداروں سے لے کر مزارعوں/ ہاریوں، کھیت مزدوروں میں تقسیم کی جائے۔ دوسرا یہ کہ جاگیردار اور بڑا زمیندار طبقہ ہی ہے جو رجعت پرستی، پیری وگدی نشینی اور پسماندہ ثقافتی روایات سے جڑا ہوا ہے اور سرکار و سامراج کی بالادستی کو تسلیم کیے ہوئے ہے۔

ان پرانے جاگیری باقیات کے اداروں کو ختم کر کے ہی صنعتی وتجارتی ترقی کی بنیادیں ملک میں نئے جمہوری اداروں کو دوام بخش سکتی ہیں۔ لہذا ملک میں جمہوریت اور جمہوری ادارے اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتے جب تک جاگیری باقیات اور بڑی زمینداریوں کا خاتمہ نہیں ہو جاتا لیکن پاکستان میں ان جاگیری باقیات اور بڑی زمینداریوں کے خاتمے کی جدوجہد انتہائی مشکل اور کٹھن ہے، ایک تو سرمایہ دار طبقہ جو کلاسیکی طور پر تو جاگیرداری کا مخالف ہے مگر پاکستان میں ایک تو اس طرح سے سرمایہ داری اور صنعت کاری نے ترقی نہیں پائی جیسا کہ یورپ یا دوسرے ممالک میں ہوا یہاں زیادہ تر گماشتہ سرمایہ داری اور فوج جو زیادہ عرصہ براہ راست اقتدار میں رہی ان جاگیرداروں اور زمینداروں کے ساجھے دار بن

گئے اور ان تمام نے مل کر سامراج کی بالادستی کو تسلیم کر لیا اور ترقی پسند ومحبِّ وطن قوتوں کو کچلنے کے درپے رہے۔ لہذا یہاں بنیادی زرعی اصلاحات کے نفاذ کے لیے ایک تو ملکی سطح پر حقیقی جمہوری وترقی پسند قوتوں کا اتحاد ضروری ہے دوسرے بڑے پیانے پر زرعی معاشرے کسانوں، چھوٹے زمین کے مالکان، مزارعوں/ ہاریوں، کھیت مزدوروں کی بڑی تحریک کو منظم کرنے کی ضرورت ہے جس کا رشتہ شہروں کے مزدوروں ومحنت کش عوام کے ساتھ ہو۔ اس کے بغیر نہ ہم بنیادی زرعی اصلاحات نافذ کرا سکتے ہیں نہ ہی معاشرے میں بنیادی سماجی تبدیلی آسکتی ہے۔

میں نے اس سے پہلے فوجی ساجھے داروں کی بات کی ہے۔ ذرا غور کریں کہ

فیلڈ مارشل ایوب خان کے نافذ کردہ پہلے مارشل لا اور 1959 کی زرعی اصلاحات کے بعد ہر فوجی آمر نے زرعی اصلاحات کے خلاف رکاوٹیں کھڑی کیں اور زمیندار طبقے کے معاشی وسماجی اور سیاسی مفادات کو مزید مضبوط کیا کیونکہ فوج خود زرعی، تجارتی وصنعتی مفادات میں شامل ہوتی چلی گئی۔ جنرل پرویز مشرف نے 1999ء میں اقتدار سنبھالا اور 2001ء میں انکم ٹیکس کا نیا قانون نافذ کیا۔ انگریزی دور کے انکم ٹیکس قانون میں ایک باب زرعی آمدنی کا تھا۔ بعد میں زرعی آمدنی کو انکم ٹیکس سے چھوٹ دے دی گئی مگر جنرل مشرف کے دیئے گئے قانون میں زرعی آمدنی کے باب کو ہی ختم کر دیا گیا ہے جیسے زرعی آمدنی، آمدنی کے زمرے میں ہی نہیں آتی۔ جس کے نتیجے میں زراعت سے متعلق لوگوں کی لامحدود آمدن انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔ دوسرا 2007ء میں Corporet Farming Act نافذ کیا گیا جس کے تحت بڑی اراضی ان پاکستانی یا بیرونی کمپنیوں کو لیز کرنے کا اختیار دیا گیا ان کمپنیوں کو کم سود پر قرضوں اور زرعی مشینری درآمد کرنے پر ٹیکس کی چھوٹ دی گئی وہ اپنی مرضی کی کاشت کر کے فصل یا آمدنی بیرون ملک لے جاسکتے ہیں۔ اس طرح زرعی شعبے

میں دیہات کے غریبوں، کسانوں، ہاریوں، کھیت مزدوروں کو زمین الاٹ کرنے اور ان کی معاشی وسماجی ترقی کے بجائے مقامی اور بیرونی سرمایہ کاروں کی لوٹ کھسوٹ کا نیا راستہ کھولا گیا ہے۔ اس قانون کی روشنی میں پورے ملک میں 91 لاکھ ایکڑ زمین کی نشاندہی کی گئی ہے جو چاروں صوبوں میں ان کمپنیوں کو لیز کی جاسکتی ہے جن علاقوں یا اضلاع کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں:

پنجاب میں ڈیرہ غازی خان، بہاولپور، راولپنڈی اور لاہور۔

سندھ میں: میر پور خاص، سانگھڑ، حیدرآباد اور لاڑکانہ۔

خیبر پختونخوا میں: ڈیرہ اسماعیل خان، ہزارہ اور کوہاٹ۔

بلوچستان میں: قلات، کوئٹہ، نصیرآباد اور مکران۔

اس لیے ہمیں ملک میں بنیادی زرعی اصلاحات کے ذریعے حد ملکیت 25 ایکڑ نہری اور 50 ایکڑ بارانی فی کاشت کار خاندان کے طور پر مقرر کرنے، فالتو زمین بے زمین کسانوں، مزارعوں/ ہاریوں، کھیت مزدوروں میں مفت تقسیم کرنے کے ساتھ انہیں آسان شرائط پر قرضوں اور سستی زرعی مشینری دینے کے مطالبات، زرعی آمدنی پر فوری انکم ٹیکس نافذ کرنے اور Corporet Farming ایکٹ 2007 کی منسوخی، غیر حاضر زمینداروں کے خاتمے اور خود کاشت کے علاوہ زرعی زمین کی الاٹمنٹ پر پابندی عائد کرنے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔

مغلیہ اور انگریزی دور کے جاگیرداروں اور بڑے زمیندار خاندانوں کے علاوہ پاکستان بننے کے بعد غیر حاضر زمینداروں کا نیا طبقہ فوجی افسران کا ہے۔ انگریزی دور میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں اعلیٰ کارکردگی اور بہادری کے انعام کے طور پر فوجی افسران کو زمین الاٹ کی جاتی تھی۔ مگر اس کے بعد تو ایک سلسلہ شروع ہوا پہلے بیراجز ایریا میں

الاٹمنٹ کی گئیں پھر سندھ اور پنجاب میں فوجی افسران کو وسیع پیمانے پر نہ صرف شہری علاقوں میں رہائشی اسکیموں بلکہ زرعی زمین کی الاٹمنٹ کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا بلکہ پنجاب میں تو بڑے بڑے جنگلات کا خاتمہ کر کے بہترین زرعی زمین فوجی افسروں کو سیکڑوں ایکڑ کے حساب سے الاٹ کی گئی، پرویز مشرف کے دور میں پیرووال کے جنگلات کی الاٹمنٹ ایک مثال ہے۔ الاٹمنٹ کے بعد یہ افسران زمین ٹھیکے پر دے دیتے ہیں اور لاکھوں، کروڑوں کی ٹیکس فری آمدنی لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فوج کے زیرِ انتظام زرعی فارمز میں پنجاب میں 50,127 ایکڑ بہترین زرخیز زرعی رقبہ فوج کے زیر انتظام ہے جس میں 12,119 ایکڑ وفاقی حکومت کا ہے اور باقی پنجاب حکومت کا۔ بڑے بڑے ملٹری فارمز میں:

اوکاڑا: =17,013 ایکڑ

رینالہ: =3,115 ایکڑ

بنھگالی لاہور: =4,341 ایکڑ

پرونا آباد: =10.433 ایکڑ

پاک پٹن: =15,022 ایکڑ

ان فارمز کی زمینات وفاقی حکومت اور صوبائی حکومت نے لیز پر ملٹری فارمز اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کو دی تھیں جو لیز کی مقررہ مدت ختم ہوگئی ہے مگر وفاقی حکومت کے زیر کنٹرول زمین جیسے بنگھالی لاہور فارم فوج کو مفت الاٹ کردی تھیں مگر پنجاب حکومت کے زیر انتظام لیز ختم ہونے کے باوجود فوج دعویدار ہے اور مزارعین کو غیر قانونی طور پر بے دخل کیا جارہا ہے ان مزارعین کی اپنے موروثی حقوق کی جدوجہد جاری ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ان فامرز کی زمین مزارعین کو مفت الاٹ ہونی چاہیے کیونکہ بنیادی اصول کے طور پر زمین اسی کی ہے جو

کاشت کرتا ہے لہذا اس بڑے زمین دار طبقے کے علاوہ فوجی جنتا اپنے معاشی مفادات کے تحت ملک میں زرعی اصلاحات میں بڑی رکاوٹ ہے۔

زرعی اصلاحات کا ایک اور پہلو جس کو سب نظر انداز کرتے ہیں وہ اپر پنجاب کا بڑا حصہ جہاں بڑی زمینداریاں نہیں ہیں اور لوگ چھوٹے چھوٹے زمین کے قطعات کے مالک ہیں یعنی گجرانوالہ سے اوپر گجرات، جہلم، چکوال، راولپنڈی، اٹک، میانوالی وغیرہ اور کے پی کے بھی شامل ہے۔

یہ چھوٹے کسانوں کے علاقے ہیں جہاں ان کی زمین چھوٹے چھوٹے قطعات میں بکھری ہے یعنی اشتمالِ اراضی نہیں ہوئی پنجاب ریونیو قانون کے تحت اگر 80 فیصدی دیہات کے کسان لکھ کر دیں تو اشتمال ہوسکتا ہے مگر کسانوں میں سیاسی شعور کی کمی اور سماجی پسماندگی ہے، وہ لکھ کر نہیں دیتے کیونکہ ان کے خیال میں ان کی بہتر زمین کا ٹکڑا بااثر زمیندار لے جائیں گے لہذا اشتمالِ اراضی قانوناً ہونی چاہیے تاکہ کسی کی چند ایکڑ زمین ایک جگہ جمع ہوجائے تو وہ ٹریکٹر سے کاشت کرا سکتا ہے یا ٹیوب ویل لگا سکتا ہے اور اس کی آمدنی بہتر ہوجائے گی لیکن ہمارے حکمرانوں کے پاس عوامی مفاد کی اتنی کمٹمنٹ بھی نہیں ہے کہ اس قسم کی اصلاحات نافذ کرسکیں جس میں غریب کسانوں کی معاشی حالت قدرے بہتر ہو۔

زرعی اصلاحات کے یہ سوالات صرف محنت کش طبقے کی سیاست کرنے والی پارٹی ہی اٹھا سکتی ہے جو پاکستان میں بنیادی سماجی تبدیلی لانا چاہتی ہے جس کا منتہائے مقصود ملکی اور عالمی سطح پر ایک ایسے سماج کا قیام ہے جس میں ہر شخص سے اس کے علم و ہنر کے مطابق کام لیا جائے اور اس کے کام کے مطابق معاوضہ دیا جائے اور یوں سوشلزم کے نظام کی تعمیر سے بالآخر انسان کا انسان کے ہاتھوں استحصال کا خاتمہ ممکن ہوسکے۔

عوامی ورکرز پارٹی نے اپنی تیسری کانگرس منعقدہ لاہور 12,13 مارچ 2022 میں یہ عہد کیا ہے کہ جاگیرداری اور قبائلی باقیات اور بڑی زمینداری کے خاتمے کے لیے منشور میں دی گئی بنیادی زرعی اصلاحات کی پالیسی میں 25 ایکڑ نہری اور 50 ایکڑ بارانی زمین فی کاشت کار خاندان ملکیت مقرر کرنے، فالتو زمین کسانوں، مزارعوں/ ہاریوں، کھیت مزدوروں میں مفت تقسیم کرنے، سرکاری زمینوں پر کوآپریٹیو فارمنگ اور اجتماعی کاشتکاری کے فروغ اور بارانی علاقوں میں اشتمالِ اراضی کے لیے جدوجہد کو منظم کرنے کے لیے کسان/ ہاری کمیٹیوں اور کھیت مزدوروں کی تنظیموں کو منظم کیا جائے گا۔ زراعت میں مشین کاری اور ٹیکنالوجی کے استعمال کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر کھیت مزدوروں کے حقوق کے حصول کے لیے مزدور قوانین کی تشکیل و نفاذ کی جدوجہد کی جائے گی۔ کھاد، بیج، کیڑے مار دواؤں کی قیمتوں میں کمی، کثیر القومی کمپنیوں کے استحصال کے خاتمے اور زمین کے چھوٹے مالکان اور زرعی شعبے کے مسائل کو اجاگر کرنے، بڑی زمینداری کے خلاف اور ایک مربوط زرعی پالیسی کے نفاذ کے لیے ایک سے زیادہ عوامی تنظیموں کی تشکیل و تنظیم کی جائے گی۔

پانی کی تقسیم کا مسئلہ

برصغیر ہند جو مختلف ریاستوں کی یونین تھا، اس کی تقسیم کے بعد بھارت آئینی طور پر مختلف ریاستوں کی یونین بن گیا اور پاکستان میں بھی مختلف صوبائی اکائیوں کی بنیاد پر وفاقی مملکت بننے کا اعلان کیا گیا جس کی بنیاد ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان پر رکھی گئی۔ پاکستان جو کثیر الاقوامی مملکت ہے، اس کے مختلف صوبے، مختلف قومیتوں اور لسانی اکائیوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان میں معاشی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی و لسانی ناہمواریاں ہیں۔ لہٰذا اس وقت تک ایک مضبوط اور ترقی یافتہ پاکستان کی تعمیر ممکن نہیں ہے جب تک اس میں بسنے والی تمام قومیتیں، لسانی اکائیاں اور صوبے برابر معاشی، سیاسی و سماجی ترقی نہیں کرتے، عوام مرکز یا وفاقی سطح سے لے کر نچلی شہری سطح تک برابر سیاسی اقتدار میں شریک نہیں ہو جاتے، مگر بد قسمتی سے پاکستان کے قیام کے فوراً بعد ہی لسانی تضادات انتہائی شدت سے ابھر کر آئے، بلکہ چند ہی سالوں بعد پاکستان کے وفاق کی بنیاد ہی کو تبدیل کر دیا گیا۔ یعنی اکتوبر ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کے قیام سے دو پاکستان یعنی مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان وجود میں لائے گئے اور اس طرح پاکستان کے چھوٹے صوبوں میں ایک بڑے صوبے کے خلاف سیاسی و معاشی حقوق سے محرومی کی جدوجہد کا طویل آغاز ہوا، میں اس جدوجہد کی طوالت میں نہیں جانا چاہتا، صوبوں کے درمیان پانی کی تقسیم کے حقیقی تنازعہ کو سمجھنے کے لیے اس پس منظر کو جاننا ضروری ہے۔ بارہ (۱۲) سال کی طویل اور پرتشدد جدوجہد کے نتیجے میں ون یونٹ کو توڑنے کا اعلان تو ۱۹۶۸ء میں جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء نے کیا مگر حکمرانوں کی ان آمرانہ پالیسیوں کا منطقی نتیجہ مشرقی پاکستان سے علیحدگی یا بنگلہ دیش کے قیام پر منتج ہوا۔

۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین میں ایک دفعہ پھر نئے پاکستان کی وفاقی حیثیت کو قائم کیا گیا مگر عملی طور پر چند ماہ بعد ہی وفاقی اکائیوں کو معاشی حقوق تو کجا محض سیاسی اقتدار میں محدود حصہ داری سے بھی محروم کر دیا گیا۔ دو صوبے بلوچستان و پشتون خواہ مرکز کے خلاف پرتشدد سیاسی جدوجہد کی طرف جانے پر مجبور ہوئے اور نتیجہ تیسرے مارشل لا تک پہنچا اور ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء تک طویل مارشل لائی و نیم مارشل لائی تاریخ کی سیاہ ترین آمرانہ حکومت قائم رہی جس نے ۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین کی بنیادیں ہی تبدیل کر دیں۔ صوبائی خودمختاری و صوبائی اختیارات تو کجا ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۸ء دس سال کے اس عرصے میں چار مرتبہ قومی و صوبائی اسمبلیوں کو برخاست کیا گیا۔ اس سیاسی پس منظر میں چھوٹے صوبوں اور ان کی قیادت کا مخصوص مسائل سے قطعِ نظر عمومی طور پر مرکز یا بڑے صوبے سے بدظن ہونا قدرتی امر ہے اور جب تک ایک حقیقی وفاقی ریاست قائم نہیں ہوجاتی جس میں تمام صوبوں کو سیاسی اقتدار نہ صرف مرکز سے صوبوں تک بلکہ صوبوں سے نچلی شہری و دیہی سطح تک منتقل نہیں ہوجاتا، کالا باغ ڈیم اور اس طرح کے دیگر مسائل ابھرتے رہیں گے اور تمام صوبوں کے حکمران طبقات اپنے اپنے مفادات کے مدِنظر، عوام کے اجتماعی معاشی و سیاسی مسائل کو پسِ پشت ڈال کر اور کسی ایک مسئلے کو بنیاد بنا کر سیاسی کشمکش میں اضافہ کرتے رہیں گے۔

اب ذرا پانی کی تقسیم اور بڑے ڈیموں کی تعمیر کی طرف آئیں۔ میرے خیال میں ان مسائل کے اہم پہلو معاشی و سیاسی اور تکنیکی ہیں۔ معاشی و سیاسی لحاظ سے اصل مسئلہ انڈس دریائی نظام اور اس کے پانیوں کی تقسیم کا ہے جو بیسویں صدی کے آغاز سے ہی سندھ اور پنجاب کے درمیان چلا آرہا ہے۔ ۱۹۰۱ء میں برطانوی حکومت نے انڈیا آبپاشی کمیشن قائم کیا جس کے سامنے اور مسائل کے علاوہ پنجاب اور سندھ کے درمیان پانی کی تقسیم کا مسئلہ بھی تھا۔ کمیشن کے فیصلے کے مطابق پنجاب کے لیے لازمی قرار دیا گیا کہ دریائے انڈس پر کوئی بھی پروجیکٹ تعمیر کرنے کے لیے سندھ کی منظوری لی جائے، ۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت سندھ اور پنجاب کے درمیان پانی کی تقسیم کے تنازعات طے کرنے

کے لیے تمام اختیارات وائسرائے ہند نے لے لیے' انہی اختیارات کے تحت جب ۱۹۱۹ء میں پنجاب کی حکومت نے سکھر بیراج پروجیکٹ کے مقابلے میں تھل پروجیکٹ پیش کیا تو اسے وائسرائے ہند نے مسترد کر دیا۔

پنجاب اور سندھ کے درمیان پانی کی تقسیم کے تنازعہ کو طے کرنے ۱۹۳۵ء میں یو پی کے چیف انجینئر انڈرسن کی سربراہی میں انڈرسن کمیٹی قائم کی گئی۔ انڈرسن کمیٹی نے ۱۹۳۷ء میں رپورٹ پیش کی مگر حکومت سندھ نے کمیٹی کی سفارشات کو ماننے سے انکار کر دیا اور دوبارہ اپنا مقدمہ گورنمنٹ آف انڈیا کے سامنے پیش کیا۔ ستمبر ۱۹۴۱ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک اور کمیشن کلکتہ ہائی کورٹ کے جج بی۔ این۔ راؤ کی سربراہی میں قائم کیا' اس کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی اور پہلی مرتبہ اس کمیشن کی سفارشات کو سندھ اور پنجاب حکومت نے تسلیم کر لیا' سوائے اس کے کہ حکومت پنجاب کو دو کروڑ روپیہ سندھ کو دینے پر اعتراض تھا جو کہ راؤ کمیشن نے سندھ میں دو بیراج تعمیر کرنے کے اخراجات کے ایک حصے کے طور پر دینے کا فیصلہ دیا تھا مگر ۱۹۴۵ء کے بعد برصغیر کے تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کی وجہ سے دونوں صوبوں کی اسمبلیوں سے اس کی منظوری نہ لی جا سکی' البتہ یہ واحد معاہدہ ہے جس پر دونوں صوبوں کی حکومتیں متفق ہو گئی تھیں۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے درمیان پانی کی تقسیم کے مسئلے نے سب سے اہم اور نزاعی صورت اختیار کر لی لہذا ۱۹۵۲ء سے ورلڈ بینک کے تحت انڈس واٹر ٹریٹی کے لیے دونوں حکومتوں کے درمیان مذاکرات شروع ہو گئے۔ پاکستان کی طرف سے مذاکراتی ٹیم میں نہ صرف پنجاب اور سندھ کی حکومتوں کے نمائندے شریک تھے بلکہ ریاست بھاولپور اور خیر پور کی بھی نمائندگی تھی اس کے تمام ریکارڈ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کی مذاکراتی ٹیم کے درمیان اندر کی چپقلش زیادہ شدید تھی۔ مگر پاک' بھارت مذاکرات نے اس حد تک طول پکڑا کہ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ قائم ہو گیا اور پاکستان کی پہلی مذاکراتی ٹیم کی جگہ انڈس واٹر ٹریٹی ایڈوائزری بورڈ کے نام سے نئی مذاکراتی ٹیم

مقرر کر دی گئی' جس کے تمام اراکین پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ آخر میں پاکستان و بھارت کے درمیان ستمبر ۱۹۵۶ء میں انڈس واٹر ٹریٹی پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے انڈس دریائی نظام کے تین مشرقی دریاؤں یعنی ستلج' بیاس اور راوی کو کلی طور پر بھارت کے اختیار میں دے دیا گیا' جس کے عوض بھارت نے ۱۷۵ ملین ڈالر ادا کیے' ۱۵۰ ملین ڈالر ورلڈ بنک اور ۱۵۰ ملین ڈالر دیگر ممالک نے، جس سے منگلا اور تربیلا ڈیم کی تعمیر کرنے کے منصوبے طے کیے گئے۔ اس طرح انڈس واٹر ٹریٹی کے تحت تین مشرقی دریاؤں کے پانی پر بھارت کے کنٹرول کے بعد سندھ کو پانی کا جو نقصان اٹھانا پڑا' منگلا اور تربیلا سے پورا نہیں کیا جا سکا۔ لہذا پاکستان کے مختلف صوبوں کے درمیان اور خاص کر سندھ اور پنجاب کے درمیان انڈس دریائی نظام کے پانیوں کی تقسیم کا مسئلہ پہلے سے زیادہ ابھر کر سامنے آیا لہذا ۱۹۶۰ء کے بعد کئی کمیشن تشکیل دیئے گئے مثلاً ۱۹۷۰ء میں فضل اکبر کمیشن' ۱۹۸۱ء میں انوار الحق کمیشن اور ۱۹۸۳ء میں حلیم کمیشن' مگر تمام کمیشن شدید اختلافات کا شکار رہے۔ جولائی ۱۹۷۳ء میں مرکزی حکومت کی صوبائی رابطے کی وزارت کے تحت حکومتِ سندھ اور پنجاب کے درمیان چشمہ جہلم لنک کنال کا عبوری معاہدہ ہوا جس کے تحت حکومت پنجاب کی درخواست پر سیلاب کے موسم میں نہر نچلی سطح پر کھولنے کا فیصلہ ہوا مگر اس کے بعد معاہدے کے برخلاف یہ نہر مستقل کھول دی گئی' جس پر سندھ کا شدید احتجاج ہے۔ یہ حالات ہیں جن کے مدنظر کالا باغ ڈیم کے متعلق بھی سندھ کے خدشات انتہائی شدید ہیں کہ کوئی معاہدہ بھی طے پا جانے کے باوجود اس پر عمل ہوگا کہ نہیں اور نہری نظام واپڈا کے سپرد ہونے کا مطلب پنجاب یا مرکز کے سپرد ہے۔

کالا باغ ڈیم کے مسئلے کا ایک پہلو پانی کی تقسیم کا ہے مگر اس کا حل محض پانی کی تقسیم کا معاہدہ نہیں جو کہ ۱۹۹۱ء میں ہوا، اس پر اعتراض اس وجہ سے بھی ہے کہ اس وقت سندھ میں جام صادق علی کی حکومت' سندھ کی نمائندہ اور جمہوری حکومت سمجھی نہیں جاتی تھی اور اس نے

اپنے اقتدار کے لیے سندھ کے مفادات کو قربان کر دیا مگر اس معاہدے پر بھی ۱۹۷۳ء کے معاہدے کی طرح عمل نہیں ہوا۔ ۱۹۹۱ء کے معاہدے کی ایک انتہائی اہم شق یہ تھی کہ صوبوں کے درمیان پانی کی تقسیم کے اختیارات واپڈا کو دینے کے بجائے انڈس ریور سسٹم اتھارٹی (ارسا) کو دیئے جائیں گے جو کہ نیا ادارہ قائم کیا جائے گا جس میں تمام صوبوں کے نمائندے ہوں گے اور اس کا ہیڈ کوارٹر لاہور میں ہوگا اور اگر ۱۹۹۱ء کے معاہدے میں کسی ترمیم کی ضرورت ہوئی تو اس کا مجاز چیئرمین نہیں بلکہ یہ ادارہ ہوگا، اس کے بعد ارسا کا ہیڈ کوارٹر بغیر ادارے کی منظوری کے اسلام آباد منتقل کر دیا گیا' دوسرا اس معاہدے کے تحت ۱۰ ایم۔اے۔ایف پانی کوٹری کے نیچے سمندر میں چھوڑنا تھا تاکہ Sea intrusion سے بچا جا سکے' اس پر بھی عمل نہیں ہو رہا ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ پانی کی تقسیم کے جتنے معاہدے ہوئے ہیں اُن پر بھی اُن کی روح کے مطابق عمل نہیں ہوا جس کی وجہ سے چھوٹے صوبوں کے عوام کا اعتماد بالکل اٹھ چکا ہے اور وہ کسی اور معاہدے کے لیے تیار نہیں، دوسرا ۱۹۹۱ء کے معاہدے میں کالا باغ ڈیم متنازعہ مسئلہ نہیں تھا لہٰذا کالا باغ ڈیم کا مسئلہ ۱۹۹۱ء کے پانی کی تقسیم کے معاہدے سے زیادہ وسیع، چاروں صوبوں کے باہمی مفادات کو مدِنظر رکھتے ہوئے حل کا طالب ہے جس میں چاروں صوبائی اکائیوں کا اتفاق ضروری ہے۔ یہ مسئلہ پوری ریاست کو حقیقی وفاقی روح کے مطابق جمہوری طور پر چلانے کا ہے، خصوصاً معیشت کے زرعی ڈھانچے میں تبدیلی کا ہے' اختیارات کے نچلی سطح تک تقسیم کا ہے' تمام علاقوں کی برابر معاشی ترقی کا ہے تاکہ وفاق پر وہ اعتماد بحال ہو سکے جو پچھلے پچاس سالوں میں نہیں ہوا۔

تکنیکی طور پر تو مسئلے کا حل ہو سکتا ہے یعنی سائنٹفک کنٹرول سسٹم' ڈیم کی تعمیری تیکنک سے صوبہ سرحد/ پشتونخواہ کے خدشات کو بھی ختم نہیں تو کم کیا جا سکتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ مسئلہ اصل میں معاشی و سیاسی ہے جس کا حل مختصر عرصے میں یعنی فوری ممکن نہیں اور

موجودہ فضا میں ڈیم کی تعمیر ملک کی وفاقی حیثیت کو مزید کمزور کر دے گی اور معاشی و سیاسی کشمکش میں اضافہ ہوگا جس کا فائدہ محض تنگ نظر قوم پرستی اور جاگیرداروں کا ہی ہوگا خصوصاً جب کہ تین صوبوں یعنی پشتونخواہ' سندھ اور بلوچستان کی حکومتیں اور اسمبلیاں تقریباً متفقہ طور پر مخالفت کر رہی ہیں۔

کالا باغ ڈیم کی تجاویز پر ۱۹۵۳ء میں سروے شروع ہوا اور ۱۹۷۳ء تک اس منصوبے کا مقصد بجلی پیدا کرنا اور پانی کا ذخیرہ کرنا تھا تاکہ خشک سالی اور منگلا اور تربیلا ڈیم میں مٹی آنے کے اضافے سے پانی کی کمی کو پورا کیا جا سکے مگر ۱۹۸۴ء سے اس کے مقاصد میں تبدیلی پیدا کر دی گئی یعنی اس ڈیم سے دائیں اور بائیں طرف دو نہریں نکالی جائیں گی جس سے صوبہ سندھ کے خدشات میں مزید اضافہ ہوا ہے اب تک کالا باغ ڈیم کی منصوبہ بندی پر ہی ایک ارب روپیہ خرچ ہو چکا ہے اور ۱۹۸۷ء کے اندازے کے مطابق کالا باغ ڈیم پر کل اخراجات ۵'۱۵۳ بلین امریکی ڈالر آنے تھے جو اَب بڑھ کر دوگنا ہو سکتے ہیں پاکستان معاشی طور پر کنگال اور تباہی کے دہانے پر ہے' سیاسی طور پر تقسیم در تقسیم پھر ان حالات میں ایٹمی دھماکے کے ساتھ کالا باغ ڈیم کی تعمیر شروع کرنے کا دھماکہ کیوں کیا گیا اور پہلے تو موجودہ حکمرانوں کی طرف سے کہا گیا کہ وزیراعظم نواز شریف ۱۴ اگست کو ڈیم کا سنگِ بنیاد رکھیں گے۔ اس طرح کے عظیم منصوبے کی تعمیر کے لیے سرمائے کے ذرائع کو اس طرح پوشیدہ رکھا جا رہا ہے جیسے یہ بھی کوئی ایٹمی دفاعی منصوبہ ہو، ان معاشی حالات میں اس طرح کے منصوبے پر عمل درآمد ناممکنات میں سے ہے، میرے خیال میں وزیراعظم نواز شریف اور ان کی مسلم لیگ جو پنجاب کے بڑے بڑے زمینداروں اور سرمایہ داروں کی نمائندگی کرتی ہے، ایٹمی دھماکے کے ساتھ کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے اعلان سے دو سیاسی فوائد حاصل کرنا چاہتی تھی' ایک تو یہ ڈیم کی تعمیر کے اعلان سے پنجاب کے زمیندار طبقے خاص کر سرائیکی بولنے والے علاقے کی سیاسی حمایت حاصل کی جائے اور اپنے مخالفین سابق صدر فاروق

لغاری اور پی پی پی کا اس علاقے میں اثر کم کیا جائے' سرائیکی علاقے اور سندھ کے درمیان تضاد کو ابھارا جائے جو مرکزی پنجاب کے اقتدار کے خلاف بعض اوقات اتحادی بن جاتے ہیں' سرمایہ داروں کو خوش کیا جائے کہ صنعتیں لگانے کے لیے سستی بجلی فراہم ہوگی، دوسرا ایٹمی دھماکے کے نتیجے میں جو مزید قومی اور بین الاقوامی معاشی دباؤ آنا ہے اور مہنگائی اور بیروزگاری کا جن کہیں حکمرانوں کے خلاف عوامی غضب نہ اختیار کر لے اس سے پہلے اس کا رخ کالا باغ ڈیم کی طرف موڑ دیا جائے' خواہ وقتی طور پر سہی۔ چنانچہ اندازے کے عین مطابق تمام قوم پرست اور حکمران طبقات کی سیاسی پارٹیوں نے کالا باغ ڈیم کے مسئلے کو اس طرح اٹھایا کہ باقی تمام مسائل پیچھے چلے گئے مگر یہ طوفان ایک اعلان کے ساتھ بیٹھ جائے گا کہ کالا ابھی ڈیم نہیں بنے گا۔

لیکن زراعت کی ترقی کے لیے پانی کی تقسیم کا مسئلہ انتہائی اہم ہے خاص کر چھوٹے صوبوں اور بالخصوص سندھ کے لیے جس کی زراعت' ماحولیات، ماہی گیری اور Sea intrusion وغیرہ شدید متاثر ہو رہے ہیں مگر پانی کی تقسیم کے بھی مختلف پہلو ہیں، ایک تو مختلف صوبوں کے درمیان پانی کی تقسیم کے مسائل اور دوسرا صوبوں کے اندر پانی کی تمام کاشت کاروں کے درمیان منصفانہ تقسیم، غور کریں آخر کیا وجہ ہے کہ Tail end پر بیٹھے ہوئے بڑے زمیندار کو تو پانی ملتا ہے مگر اوپر شروع کے چھوٹے کاشتکار کو پانی نہیں ملتا جس کی تفصیل میں اس مختصر مضمون میں نہیں جاسکتے، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پانی کی تقسیم کا مسئلہ ہمارے ہاں جاگیری باقیات اور بڑی زمینداریوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور اس کے ذمہ دار تمام صوبوں کے بڑے زمیندار ہیں لہذا پورے زرعی نظام میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے بلکہ پورے معاشی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے اسی طرح عوام کے بے پناہ معاشی وسماجی مسائل جن میں بیروزگاری' تعلیم اور صحت کے بنیادی مسائل کو ثانوی حیثیت نہیں دی جاسکتی اور یہ ہمارے آج کے قومی ایجنڈے کے انتہائی اہم نکات ہیں۔ اس

کے ساتھ ہی پاکستان کا ہر ذی شعور شخص ملک میں صنعتی ترقی کے لیے سستی بجلی کی پیداوار کی ضرورت سے انکار نہیں کرسکتا اور نہ ہی زرعی ترقی کے لیے پانی کی ضرورت سے لہذا اگر ترجیح، صنعتی ترقی کرنی ہے تو اس کے لیے سستی بجلی کی پیداوار کے لیے کئی عرصہ سے روس کی طرف سے ایٹمی بجلی گھروں کی پیش کش موجود ہے جس کے لیے آج بھی سنجیدگی سے غور کی ضرورت ہے اور اب تو پاکستان خود ایک ایٹمی طاقت ہے اس ایٹمی توانائی کو اسلحہ سازی کی بجائے صنعتی ترقی کے لیے استعمال میں لانے کی ضرورت ہے اور اگر اسی طرح ترجیح زرعی ترقی کی ہے تو اس کے لیے پہلے زرعی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور زرعی اراضی کو سیراب کرنے کے لیے متبادل چھوٹے ڈیم بنائے جاسکتے ہیں جن پر دریائی پانی کی تقسیم کے بین الاقوامی اصولوں کے مطابق تمام صوبوں میں اتفاق ہو مگر اس کے لیے ملک میں پارلیمانی نظام کی مضبوطی' حقیقی معنوں میں جمہوری اداروں کا قیام اور ان کے تحت سیاسی اعتماد کی فضا قائم کرنا ضروری ہے۔